Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue 2
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

تہمینہ ممتاز

اسکالر پی ایچ-ڈی اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر انصر عباس

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، میانوالی یونیورسٹی، میانوالی

اردو ناول میں قنوطیت بحوالہ "پریشر ککر"

Tahmina Mumtaz
PhD Scholar Urdu Federal Urdu University, Islamabad
Dr. Ansar Abbas
Assistant Professor UrduUniversity of Mianwali, Mianwali

Pessimism In Urdu Novel With Reference To "Pressure Cooker"

Pessimism has remained the subject of discussion with different Urdu writers of the subcontinent, particularly, Pakistani writers. Siddique Salik's novel "Pressure Cooker" is one of those novels that represent the pessimist Articles of a deprived class of the Pakistani society. These Artists are helpless in front of social injustices and inequalities. Moreover, they (Artists) are unable to depict the issues of their societies. The novel shows how the society has banned their freedom of thinking and expression. Further, it also reveals that those artists who follow the traditional tides become successful, but others, like central character of the novel, Fitrat, who are men of principles, realists, helpful and have courage to say no to cruel forces and destined to pessimism.

Keywords: Pessimism, injustices, Siddique Salik, Pressure Cooker, Pakistan, subcontinent, societies, freedom, inequalities

کلیدی الفاظ: قنوطیت، شعر و ادب، شوپن ہار، پریشر ککر، صدیق سالک، فطرت، مصور، مس نزہت، پروفیسر سعید

ادب زندگی کا عکس ہے اور اس عکس میں ہر طرح کے چہرے رونما ہوتے اور نظر آتے ہیں۔ ادب چونکہ اپنا مواد زندگی سے ہی حاصل کرتا ہے لہٰذا ہر انسان کی زندگی کئی عروج و زوال اور نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد اختتام پذیر ہوتی ہے۔ زندگی کے مسائل کچھ معاشرے کی پیداوار ہوتے ہیں لیکن کچھ انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے جیسا قرآن پاک کی سورۃ "الشوریٰ" میں اللہ کریم فرماتا ہے:

"اور تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور بہت کچھ تو وہ معاف فرما دیتا ہے۔"(۱)

بیشتر انسان زندگی کے ان مسائل کا مقابلہ بڑی جواں مردی سے کرتے ہیں اور ناشکری یا گلہ شکوہ کی بجائے سعی سے کام لیتے ہیں لیکن کچھ انسان زندگی کی مشکلات سے تنگ آکر جلد ہی حوصلہ ہار جاتے ہیں اور نوبت خودکشی تک پہنچ جاتی ہے۔ معاشرے کو موردِ الزام ٹھہرا کر خود کو بڑی آسانی سے بری الزمہ سمجھنا کسی صورت درست رویہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض افراد کی زندگی کے مسائل کچھ ایسے الجھے ہوئے ہوتے ہیں جن سے نبرد آزما ہونے کی ان میں ہمت نہیں رہتی اور وہ انسانی معاشرے سے بدظن ہو کر قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قنوطیت انگریزی زبان کے لفظ (Pessimism) کا اردو ترجمہ ہے جس کے معانی ناامیدگی، یاسیت اور محرومی وغیرہ کے ہیں۔ قنوطیت فلسفہ کی ایک شاخ ہے جس کے مطابق کسی شاعر یا ادیب کا شعری و ادبی سرمائے میں زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو بیان کرنا جن میں زندگی کے صرف تاریک پہلو ہی سامنے آئیں اور مایوسی و

ناامیدی کا غلبہ ہو، امید و خیر کی کوئی بھی صورت نظر نہ آئے تو وہ قنوطیت کے زمرے میں آئے گا۔ قنوطی شخص کی ذات شکست خوردہ ہوتی ہے اس لیے ایسا آدمی ہمیشہ زندگی کی لذتوں سے بھی محروم رہتا ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر عہد اور تمام ادب میں قنوطی خیال و فکر کی روایت موجود ہے جس کی سب سے اہم اور قدیم مثال سوفوکلیز کے ڈرامے ہیں۔ شعر و ادب میں قنوطیت کی وضاحت کرتے ہوئے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے اشیا و واقعات کا تاریک پہلو دیکھنا، زندگی کو ناقابل زیست قرار دینا اور مستقبل کے بارے میں یاس و ناامیدی کا شکار ہو جانا قنوطیت کہلاتا ہے۔''(۲)

قیام پاکستان کے بعد ہمارے ہاں جس معاشرے کی بنیاد پڑی وہ کوئی پرامید معاشرہ نہیں تھا۔اس معاشرے میں قنوطیت کا عنصر بڑا واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں قنوطیت کی اصطلاح مغربی فلسفے سے لی گئی ہے۔ اس فلسفے کا بانی شوپن ہار ہے جس کا خیال ہے کہ دنیا شر کی جگہ ہے اور اس میں موجود ہر شے میں شر پایا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''قنوطیت فکری طور پر تاریخ کے ہر دور میں رونمائی کرتی آتی رہی ہے لیکن اس منظم فلسفے کی حیثیت شوپن ہار نے دی جس نے اپنی کتاب "The World as will and Idea" میں انسانی زندگی میں شر کے ناگزیر عنصر کا مفصل تجزیہ کیا ہے۔'' (۳)

مذکورہ بالا اقتباس سے قنوطیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس رویے کی جھلک تاریخ کے ہر دور میں رہی۔ قنوطیت رجائیت کی متضاد اصطلاح ہے جس میں تمام منفی پہلوؤں کو دیکھا جاتا ہے۔ قنوطیت ایک انسانی اندازِ فکر ہے جس میں حیاتِ ارضی بدترین ہے اور یہ کائنات انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں نہ تو کوئی خیر کی توقع کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی نجات دلانے والا ہے۔ قنوطیت غم کے چند لمحات کی صرف ایک کیفیت نہیں ہے جو وقت یا جگہ کی تبدیلی سے کچھ دیر بعد بدل جائے گی بلکہ قنوطی شخص اس کیفیت کو عقیدہ کی طرح مستقل اپنا لیتا ہے اور زندگی بھر اس عقیدے پر قائم رہتا ہے۔

اردو ادب میں دیکھا جائے تو قنوطیت کا استعمال نثر سے زیادہ نظم میں ملتا ہے۔ صنفِ غزل کی مقبولیت کا بنیادی سبب اس کا ہجر و فراق سے گہرا ربط ہے۔ ہجر و فراق کے مضامین غم و یاس کی کیفیت میں اضافہ کرتے ہیں جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق قنوطیت سے ہے۔ اردو شاعری میں قنوطی شعرا میں فانی بدایونی، ناصر کاظمی، ساغر صدیقی، جون ایلیا اور منیر نیازی سرِفہرست ہیں۔ ان شعرا میں قنوطی فکر کی زیادتی کے سبب فانی بدایونی کو یاسیات کا امام بھی کہا جاتا ہے۔ کلیاتِ فانی سے اقتباس ہے:

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانیؔ

وجودِ دردِ مسلم علاج نامعلوم (۴)

اردو شاعری کے علاوہ نثر میں دیکھا جائے تو اردو ناولوں اور افسانوں میں بھی قنوطیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو معاشرہ تشکیل پایا اس میں قنوطیت کا پایا جانا ایک لازمی امر تھا کیونکہ قیام پاکستان کے فوراً بعد جتنا ادب لکھا گیا اس کا موضوع ہجرت کا کرب اور فسادات تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی ملک میں سیاسی استحکام نہ آ سکا۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں قنوطیت نے جنم لیا۔ اس قنوطیت کے اثرات ہمیں شاعری کے ساتھ اردو نثر میں بھی نظر آتے ہیں۔ اردو ناولوں میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جب صدیق سالک کے ناول پریشر ککر کو دیکھتے ہیں تو اس میں قنوطیت کی جھلک ہمیں بڑی واضح نظر آتی ہے۔اس ناول کے مرکزی کردار میں مصنف کی اپنی جھلک نظر آتی ہے۔ صدیق سالک نے ایک پس ماندہ طبقے کی کہانی بیان کی ہے۔ ناول کا کردار اصول پرست اور آزاد خیال ہے۔ وہ روایتی انداز کو اپنانے کا قائل نہیں، جس کی وجہ سے وہ اس معاشرے کی ناانصافیوں اور خود غرضیوں سے تنگ آ کر بھاگ جاتا ہے۔ مصنف نے ناول میں سرکاری عہدوں پر فائز لوگوں کو بھی دکھایا ہے کہ یہ کس طرح غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ انھوں نے سماجی ناانصافی کو کرداروں کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

صدیق سالک کا تعلق پاک آرمی سے بھی رہا لیکن وہ اپنی پہچان ایک ادیب کی حیثیت سے کروانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کا یہ پہلا ناول ہے جس میں انھوں نے بڑی جرات کے ساتھ اصول پرست اور محب وطن لوگوں کا استحصال ہوتے دکھایا ہے۔ انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ایک غریب حق کی بات کرے تو اس پر اشتراکیت کا الزام لگا کر اس کے لیے ہر جگہ مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ہمارے ملک کی بنیاد نظریہ اسلام پر رکھی گئی تھی۔ ملک کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے دعویداروں کا اثر و رسوخ صرف نعروں کی حد تک رہا۔ اس ناول میں مصنف نے ملک کے تمام لوگوں کی زیادتیوں کو بڑی باریکی سے دکھایا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مشتاق عادل اور اللہ یار ثاقب لکھتے ہیں:

''پریشر ککر، صدیق سالک کا ایسا ناول ہے جس میں انھوں پاکستانی معاشرے کے محروم طبقے کے مسائل کا عمدہ طریقے سے جائزہ لیا ہے۔ اس ناول میں ان کی اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے''(۵)

اس ناول کا مرکزی کردار ''فطرت'' نامی ایک مصور ہے۔ اسے قسمت سے بہت ہی قابل استاد ملے تھے۔ اس کے اساتذہ اس کے فن کی بہت تعریف کرتے اور اس کی ہمت اور حوصلہ بڑھاتے۔ وہ اپنے فن میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ اس نے ایک دن نسرین کا پورٹریٹ بنایا۔ فطرت نسرین کو پسند کرتا تھا مگر طبقاتی فرق کی وجہ سے وہ اظہار کرنے سے خوف زدہ تھا۔ ایک دن اس نے ہمت کر کے اپنی محبت کا اظہار کر دیا اور نسرین کو اس کا پورٹریٹ پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کو محبت کا جواب بھی محبت میں ملے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسے محبت کے بدلے نفرت بھرے لہجے کا سامنا کرنا پڑا۔ نسرین اسے کچھ اس طرح جواب دیتی ہے:

''ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے۔ ہماری نوکرانی کے پُتّر! تمھاری یہ مجال، آئندہ ایسی حرکت کی تو کوارٹر سے نکلوا دوں گی۔'' (۶)

مذکورہ بالا اقتباس سے مصنف نے ایک غریب کی محبت کو چند تلخ الفاظ میں مدغم ہوتے دکھایا ہے۔ اس دن سے فطرت خوف زدہ ہو گیا کہ کہیں شیخ صاحب اور مسز شیخ اپنے گھر سے نہ نکال دیں۔ اسے اپنی ماں کی فکر تھی کہ اس کی وجہ سے وہ کسی مشکل میں نہ پھنس جائے۔ اسی دن سے فطرت قنوطیت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اپنی پڑھائی میں نمایاں کارکردگی کی وجہ سے مشہور تھا۔ بی۔اے کرنے کے بعد وہ فیصل آباد سے لاہور چلا آیا۔ وہاں اسے قابل اساتذہ ملے۔ جنھوں نے اس کے فن کو اور نکھارا۔ لاہور میں سبھی اساتذہ اس کی عزت کرتے اور اس کی ذہانت کے گن گاتے۔ وہ اپنی کلاس میں سب سے مختلف سوچ رکھتا تھا۔ وہ روایت سے ہٹ کر سوچنے والا آرٹسٹ تھا۔ اس کے دل میں آرٹسٹ بننے کی خواہش بچپن ہی سے تھی۔ وہ ایسی پینٹنگ بنانا چاہتا تھا جس میں معاشرے کے افراد کے دکھ، درد اور غموں کو رنگوں کے ذریعے ظاہر کر سکے۔ ادب کی دنیا میں یہ پہلا تجربہ تھا جو وہ معاشرے کے سامنے نئے انداز میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہی اس کی خواہش تھی جو آخری دم تک پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ اپنے فن کے سہارے زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن یہ کام مشکل تھا۔ اس حوالے سے اس کا اپنا خیال یہ تھا:

''راستہ دشوار سہی لیکن میں آرام و آسائش کا طلب گار ہوں بھی نہیں۔ میری تو صرف ایک ہی طلب ہے جو passion (جنون) کی حدیں چھو رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں اپنی مرضی کی تصویریں بنا سکوں، جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں اسے کینوس پر منتقل کر سکوں۔ ''(۷)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنف نے فطرت کے ارادوں کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ارادوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس کا ارادہ برا نہیں تھا۔ اس کا مقصد تو غریبوں کو استحصالی معاشرے سے آزادی دلوانا تھا۔ اس سوچ کے پیچھے ایک حقیقت پنہاں تھی اور وہ اس کی ذاتی زندگی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ اور اسے اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ اس کی ماں نے اس کو کافی مشکلات سے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اسی لیے وہ غربت جیسی لعنت اور غریبوں کے ساتھ ناروا سلوک کو اجاگر کرنا چاہتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں فنکاروں کی جس طرح بے توقیری کی جاتی ہے، اس کا احاطہ صدیق سالک نے بہتر انداز میں پیش کر کے قارئین کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پریشر ککر کا مرکزی کردار فطرت اپنے فن میں مکمل مہارت رکھتا ہے۔ اس کی پینٹنگ کی شہرت دور دور تک پھیل جانے کے باوجود اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ ہمارے معاشرے میں فن کی اور غریب عوام کی کوئی حیثیت نہیں۔

ناول کے اس کردار کو اپنی زندگی کے ہر موڑ پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے ایم۔اے میں داخلے کے دوران مضمون کے انتخاب میں مسئلہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ ایم اے کر لیتا ہے اس کے باوجود کہ بہت لائق ہے اور گولڈ میڈلسٹ ہے مگر پھر بھی ملازمت کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے امید تھی کہ اسے یونیورسٹی میں بطور لیکچرار جاب مل جائے گی لیکن یونیورسٹی میں مفاد پرست ٹولے کی وجہ سے اسے جاب نہیں ملی۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے رہے جس کی وجہ سے اس میں قنوطیت کا مسئلہ بڑھ جاتا ہے۔ وہ پروفیسر سعید کے کہنے پر امریکہ چلا جاتا ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد اسے امید ہوتی ہے کہ اب اسے یونیورسٹی میں آسانی سے ملازمت مل جائے گی مگر یہاں پہنچ کر اسے نئے نئے الزمات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی ملازمت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔ امریکہ سے واپسی پر اس کی ملاقات مس نزہت سے ہوئی۔ اس نے مس نزہت کو بتایا کہ اب وہ Free Lancing کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے برش اور کینوس کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس نے انھیں یہ بھی بتایا کہ میں اس حوالے سے آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ آیا ہمارے معاشرے میں ایسا ممکن ہے۔ مس نزہت اسے ایک دوست کی حیثیت سے اپنی زندگی کے تلخ تجربات ان الفاظ میں بتاتی ہیں:

''یہاں تخلیقی عمل ذہنی عیاشی کا ذریعہ تو ہے لیکن روزی کا وسیلہ نہیں۔ میں نہ تو خود سبز باغ دیکھتی ہوں نہ دوسروں کو دکھاتی ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ جو نوکری ملتی ہے کر لو اور اگر وقت اور پیسہ فالتو ہے تو ہابی کے طور پر پینٹنگ کرتے رہو۔۔۔ لیکن اگر تم نے اپنی روزی کا معقول انتظام کئے بغیر صرف برش گھسیٹنے پر اکتفا کیا ہے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ اس معاشرے میں، ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے۔''(۸)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنف نے مس نزہت کی زبانی اداروں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے اندر جس طرح کا دوغلا پن پایا جاتا ہے، اس سارے منظر کو ناول پر یشر ککر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں اصول پرستوں کی ناکامی اور خوشامدیوں کو کامیاب ہوتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بہت سی چیزوں کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔ اس نظام میں وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے آپ کو معاشرے کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس وجہ سے حقیقت کی تلاش اور کتابی باتوں کو ماننے والے قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار اپنی سچائی اور اصول پرستی کی وجہ سے ہی قنوطیت میں مبتلا ہوتے دکھایا گیا ہے کیونکہ ہمارے نظام میں سچائی کا عنصر کم نظر آتا ہے۔ ناول میں بہت سے ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں قول و فعل میں تضاد دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک مقام پر جب ناول کا مرکزی کردار فطرت چھوٹی کلاس میں ہوتا ہے تو اس کو نصاب میں پڑھایا جاتا ہے۔ ''پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اسلام ہمیں عدل و انصاف اور غریبوں کی مدد کا سبق دیتا ہے۔'' (۹) لیکن عملی طور پر اس کے اسکول میں جب سرکاری آفیسر داخل ہوتے ہیں تو ان کی شان و شوکت اور اسکول اور اسکول کے بچوں کی حالت میں جو فرق پایا جاتا ہے اس میں بہت زیادہ تضاد ہوتا ہے۔ بچوں کے پاس بیٹھنے کی جگہ نہیں، وزیر اعلیٰ نے جب بچوں سے پوچھا کہ آپ کو تحفے میں کیا دیا جائے تو بچوں نے جواب دیا ''ٹاٹ'' وزیر اعلیٰ کے لیے یہ لفظ نیا ہوتا ہے مگر غریب عوام کے بچوں کا یہ روز روز کا معمول ہوتا ہے۔ بچے ان الفاظ میں وزیر اعلیٰ سے ٹاٹ کا مطالبہ کرتے ہیں::

''ہمیں ٹاٹ لے دیں۔ نیچے سے زمین بہت ٹھنڈی لگتی ہے۔ سردیوں میں خاص کر بارشوں میں گیلی ہو جاتی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے ازرہ عنایت ٹاٹ مہیا کرنے کا حکم دیا اور چلے گئے۔'' (۱۰)

اس اقتباس سے مصنف نے سرکاری عہدے داروں کی خود غرضی کو دکھایا ہے کہ وزیر اعلیٰ غریب بچوں کی معصوم خواہش کو بھانپ کر چلا گیا۔ ناول میں مصنف نے فطرت کے کردار کو دکھایا ہے جس میں خود غرضی نہیں بلکہ اس نے اپنے ساتھ دوسروں کی تکلیف کو محسوس کر کے چھوٹی سی فرمائش کر دی۔ فطرت معاشرے کے غریب لوگوں کے دکھوں اور غموں کا مداوا کرنے میں ناکام رہا۔ فطرت میں قوت برداشت انتہا درجے کی تھی لیکن وہ غریب عوام کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بے بس اور لاچار لوگوں کے مسائل کو اپنے فن کے ساتھ اجاگر کرنے کا سوچتا رہا لیکن معاشرے نے خود اسے غموں میں گھیر لیا۔ ایسا غم تھا جسے وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ یہ غم اسی اسلامی ملک کا دیا ہوا تھا جس کے آئیڈیل اسلامی سلطنت ہونے کے بارے میں فطرت ابتدائی کلاسوں میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ فطرت جب چھوٹی کلاس میں پڑھتا تھا کہ پاکستان قائداعظم نے بنایا۔ یہ ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ، نظریۂ اسلام ہے۔ یہ مسلمانوں کا ملک ہے جو اللہ و رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں عدل و انصاف اور غریبوں کی مدد کا سبق دیتا ہے۔ فطرت نے اس عبارت پر غور کیا تو بہت غمگیں ہو گیا۔ وہ سچا محب وطن تھا۔ ستمبر کا مہینہ تھا فطرت یہ دیکھ کر افسردہ ہوا کہ لوگ قائداعظم کی یوم وفات کا دن منا رہے ہیں اور ان کے بنانے ہوئے اصولوں پر کاربند رہنے کا عہد کر رہے ہیں۔ مگر یہ دن فطرت کے لیے تقسیم سے پہلے کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ فطرت کی بہن ذکیہ اس دن غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ بھرے بازار میں اسے کسی نے نہ بچایا۔ فطرت اور شیخ صاحب نے تھانے کچہریوں کے چکر لگائے مگر بے سود۔ اس وقت فطرت پر قنوطیت طاری ہوئی اور معاشرے کی بے حسی پر افسوس ہوا۔ اسے ماضی کا واقعہ یاد آیا اسی معاشرے میں دس سال پہلے اس کے والد نے ایک دوشیزہ کی جان بچائی تھی مگر آج اسے معاشرے کی بے حسی پر بہت دکھ ہوا۔ ذکیہ کا کہیں اتا پتا نہیں چلا۔ مصنف نے غریب عوام کے استحصال کو دکھایا ہے۔ ناول میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تھانے، کچہریوں میں بھی انصاف امیروں کے لیے ہے۔ پاکستانی معاشرے میں فطرت کا کردار قومی ثقافت میں ایک قیمتی اثاثے سے کم نہیں تھا لیکن معاشرے میں اس کردار کو سوائے گھٹن کے کچھ نہ مل سکا۔ فطرت نے اپنی زندگی میں ہر وہ کام کیا جس کے بارے میں وہ کتابوں میں پڑ چکا تھا۔ اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جو لوگ مادی آسائشوں کی تلاش اور فن کی لگن میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں وہ زندگی کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ محبت سے انسانی زندگی کو طاقت اور جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ فطرت نے محبت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تو مس نزہت اسے سمجھاتے ہوئے کہتی ہیں:

''روکو ان کتابی باتوں کو فطرت، روکو اپنے احمقانہ شاعرانہ خیالات کو، حقیقت کی طرف آؤ حقیقت کی طرف''

''حقیقت کیا ہے؟''

''حقیقت یہ ہے کہ محبت، عشق، رومانس محض وقتی فتور بن کر رہ گئے ہیں ان جذبوں کا ہمارے طبقے کے لوگوں کی زندگی میں کوئی داخل نہیں ہوتا یہ چونچلے امیروں کے ہیں، اونچے طبقے والوں کے، میرے اور تمہارے جیسے لوگ تو چٹکی بھر آٹے کی خاطر سارا دن چکی پیستے رہتے ہیں اور آٹا پھر بھی مقدر سے ہاتھ آتا ہے'' (۱۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنف نے انسان کی بے بسی کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے مس نزہت کی زندگی کے تلخ تجربات کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مس نزہت کس طرح معاشرے کے اس طاقتور اور بے لگام طبقے سے مقابلہ کر چکی ہے لیکن ناکام ہونے پر ان عناصر کو کس طرح برداشت کر رہی ہے۔ جب

فطرت نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو وہ ضبط نہ کر سکیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔اس طرح فطرت بھی اپنے اس اظہار پر افسردہ ہو کر ہوٹل کی طرف آجاتا ہے۔ اس رات اسے سکون سے نیند نہیں آتی۔ اس کے دماغ پر مس نزہت اور پروفیسر سعید کے خیالات ہتھوڑے کی طرح برستے ہیں۔اس دن کے بعد فطرت کے لیے یونیورسٹی کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ آئے روز اس پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹنے لگتے ہیں۔ فطرت کو یونیورسٹی جاب کی امید ٹوٹ جاتی ہے تو وہ پینٹنگ کے پیشے کو ہی چن لیتا ہے۔لاہور میں اس مقصد کے لیے اس نے مکان کرائے پر لے لیا۔ یہ مکان مال روڈ اور ٹی ہاؤس کے قریب پڑتا تھا۔اس مکان کے ارد گرد غریب لوگ رہتے ہیں۔فطرت نے اب اپنے ارادے کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا تاکہ روزی کما سکے۔اس کو پینٹنگ اور ادبی محفلوں میں جانا پسند ہے۔ ''وارث محلہ'' میں رہتے ہوئے وہ اکثر ٹی ہاؤس میں جاتا ہے۔امریکہ سے واپسی کے بعد کافی عرصہ کے بعد وہ ٹی ہاؤس گیا تو اس کی ملاقات چند لڑکوں سے ہوئی لیکن فطرت نے ادیبوں اور شاعروں کی محفل کو اہمیت دیتے ہوئے پروفیسر عابد حیات کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ اس کے استاد تھے۔ پروفیسر صاحب اکثر اوقات فطرت کی تخلیقی صلاحیتوں کی تعریف کرتے تھے جس سے فطرت کی حوصلہ افزائی ہو جاتی۔اس روز بھی انھوں نے فطرت سے معمولات زندگی پر بات چیت کی۔ فطرت کی زندگی میں یہ تیسرا شخص ہے جس سے وہ اپنے دل کی بات شئیر کرتا ہے۔ جب انھوں نے اس سے جاب کے بارے میں پوچھا کہ سنا تھا کہ تمہاری یونیورسٹی میں جاب کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔فطرت نے نفی میں جواب دیا تو بولے، وہ نہ سہی ابھی کیا کچھ کرتے ہو۔ فطرت نے اپنے بارے میں بتایا کہ اب وہ پینٹنگ کرتا ہے یہاں پر ایک دو آرڈر ملے ہوئے ہیں۔اس کی بات سن کر پروفیسر عابد حیات پر بھی قنوطیت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ فطرت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یوں لب گویا ہوئے:

''پھر تم تو بڑے پاپولر آرٹسٹ ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انسان برش اور رنگ کے زور پر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ہم نے تو قلم کے زور پر رہنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ مجبوراً نوکری کر لی لیکن تم نے تو وہ کر دکھایا جو ہماری نسل سے نہ ہو سکا۔یعنی اپنی تخلیق کے زور پر زندہ رہے ہو۔''(۱۲)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنف نے عابد حیات کی زندگی میں قنوطیت کو دکھایا ہے۔مگر ان کی قنوطیت اور فطرت کی قنوطیت میں فرق پایا جاتا ہے۔جب فطرت کی ملاقات عابد حیات سے ہوتی ہے تو وہ انھیں ذہنی خلش کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس سارے معاملے میں معاشرے کا کردار ہوگا۔وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر زندگی کے دوسرے رخ کو دیکھا جائے جہاں امیر رہتے ہیں تو وہاں امن و سکون ہے۔ انھیں روزگار کی فکر نہیں ہے۔ اپنی اس بے چینی اور مایوسی کا ذکر پروفیسر عابد حیات سے کرتے ہوئے فطرت کہتا ہے:

''بات یہ ہے کہ اس کام سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے پیسے مل جاتے ہیں لیکن ذہن مطمئن نہیں ہوتا۔جس دن سے میں نے یہ کام شروع کیا ہے میرے اندر ایک کشمکش Conflict پیدا ہو گئی ہے۔''(۱۳)

پروفیسر عابد حیات اس کی باتیں سننے کے بعد اسے مشورہ دیتے ہیں کہ سوچنا چھوڑ دو پھر جب فطرت ان کی اس بات پر راضی نہیں ہوتا تو کہتے ہیں کہ سوچو لیکن اسے بیان نہ کرو۔اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لو۔اس طرح کرنے سے لوگوں کو تکلیف نہیں ہوگی۔دوسرا کہ راز فاش نہیں ہوں گے تو وہ انتقام بھی نہیں لیں گے۔ یہ کام انتہائی مشکل ہے دیکھو میں تمہیں اپنی زندگی کے تجربات بتاتا ہوں۔پروفیسر عابد حیات اپنی زندگی کے تجربات بتاتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''میری زندگی کے تجربوں کا نچوڑ یہ ہے کہ اول تو سوچنا چھوڑ دو اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو اپنی سوچ کے اظہار پر خود پابندی لگا دو۔۔۔ سخت پابندی"

"یعنی اپنے ذہنی پریشر ککر کا ڈھکنا خود کس دوں"

۔۔۔"ہاں! ہمارے معاشرے میں تخلیق کار کا یہی مقدر ہے''(۱۴)

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنف نے ایک فن کار کی بے بسی کو دکھایا ہے کہ وہ کس طرح معاشرے کے ہاتھوں قنوطیت کا شکار ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار بھی مکمل طور پر نہیں کر سکتا بلکہ بعض اوقات وہ معاشرے کی قنوطیت اور اپنی حالت زار کو کھلے لفظوں تو دور کی بات چھپے لفظوں میں بھی بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے معاشرہ جینے کا حق چھین لیتا ہے۔

ناول پریشر ککر میں دوسرے پاکستانی ناولوں کی نسبت قنوطیت کا عمل دخل زیادہ ہے۔اس ناول میں ایسے افراد قنوطیت کا شکار ہیں جو معاشرے کے پڑھے لکھے لوگ کہلاتے ہیں۔ان کے اظہار خیال پر پابندی لگائی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ گھٹن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مصنف نے ناول میں ایسے لوگوں کو دکھایا ہے جو قنوطیت کا شکار ہیں لیکن بے بس و مجبور ہو کر انھوں نے معاشرے سے سمجھوتہ کر لیا۔وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا کر شکم کی پریشانی ختم کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن ناول کے مرکزی کردار کی طرح جو حقیقت پسند ہے، ان روایات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کی وجہ سے وہ قنوطیت کا شکار ہو کر تنہائی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ یہاں بہت سارے لوگوں کا یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ ہماری کامیابی کا دارومدار جھوٹ پر ہے اور وہ اپنی کامیابی کے لیے جائز و ناجائز ہر حربہ اپنانے کے لیے کمربستہ ہیں۔ موجودہ دور میں سچے انسان کی گنجائش کم رہ گئی ہے۔ریاکاری اور خوشامد کے ذریعے زندگی گزار نا شریف، انا پرست اور خوددار انسانوں کی بھی مجبوری بن چکی ہے۔

صدیق سالک کے ناول "پریشر ککر" میں ایک پسماندہ طبقے کی محرومی اور اس کے مسائل کو دکھایا ہے۔اس معاشرے میں جن لوگوں کو زبانی باتوں سے خوش کیا گیا تھا مگر جب ان پر مرضی ٹھونسی گئی تو قنوطیت کا شکار ہو گئے۔ مصنف نے ناول کے مرکزی کردار فطرت کی اس عادت کو اجاگر کیا ہے جس میں وہ کتابی باتوں کو حقیقی رنگ میں تلاش کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اردو ادب میں شاعری کے بعد اس ناول میں قنوطیت کا عمدہ نمونہ ملتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) سورۃ ۴۲، آیت نمبر ۳۰

(۲) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد: ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۷

(۳) سید عبداللہ، ڈاکٹر، ادب و فن ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۰

(۴) فانی بدایونی، کلیاتِ فانی، مرتبہ؛ ڈاکٹر ظہیر عباس، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی: ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۴

(۵) مشتاق عادل، ڈاکٹر، اللہ یار ثاقب، ''غربت اور صدیق سالک کا ناول پریشر ککر''، مشمولہ: نور تحقیق، (جلد: ۳ شمارہ: ۱۱)، شعبہ اردو لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۳

(۶) صدیق، سالک، پریشر ککر، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۷ء ص نمبر ۴۵

(۷) ایضاً ص نمبر ۱۷۹

(۸) ایضاً ص نمبر ۱۸۶

(۹) ایضاً ص نمبر ۳۷

(۱۰) ایضاً ص نمبر ۳۷تا۳۸

(۱۱) ایضاً ص نمبر ۱۸۹

(۱۲) ایضاً ص نمبر ۱۹۶

(۱۳) ایضاً ص نمبر ۱۹۷تا۱۹۸

(۱۴) ایضاً ص نمبر ۱۹۸تا۱۹۹